پریم چند کے ناولوں میں طبقاتی شعور

ڈاکٹر روبینہ الماس*

Abstract:

Prem Chand is a well known personality of Urdu fiction. He manifested social realism in his short stories and novels. His literary asset shows conscious confrontation. He depicts his social awareness or longings through subtle satire in a delicate way. He makes his reader promising regarding psychological conscious and perfect artistic skills through his style. He, usually, presents countryside life in an appropriate inactive way. He did not appear as passive viewer but strived hard to achieve ideal situation.

پریم چند اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے عہد کی زندگی اپنے ناولوں میں جزئیات کے ساتھ پیش کی ہے۔انھوں نے ادب اور زندگی کے درمیان توازن پیدا کیا ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں جو ارتقا موجود ہے وہ اس دور کے کسی اور ناول نگار کے یہاں موجود نہیں ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند کے ناولوں میں ہندوستانی تاریخ،رقم دکھائی دیتی ہے۔بقول ڈاکٹر اے۔بی اشرف:

> ''پریم چند کے ناولوں کا سلسلہ وار مطالعہ کیا جائے تو بیسویں صدی کے ابتدائی تیس پینتیس سال کی تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔گویا پریم چند کے ادب کی تاریخ پاک و ہند کے سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی تاریخ ہے۔''(۱)

پریم چند کے ابتدائی دور کے ناولوں میں ''جلوہ ایثار''،''بیوہ'' اور ''بازارِ حسن''منظرِ شہود پر ظاہر ہوئے۔ ان ناولوں میں جذبہ حب الوطنی، ہندو معاشرت اور اس کے رسوم و رواج کو جذباتی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔مگر رفتہ رفتہ ہمیں پریم چند کے یہاں جذباتی رنگ صاف ہو کر نکھری ہوئی عصری آگہی کے رنگ میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں پریم چند کی ناول نگاری نئے عہد میں داخل ہوتی ہے۔یہ وہ دور ہے جب انقلابِ روس کے اثرات ہندوستان پہنچنا شروع ہو گئے تھے،ترکِ موالات کی تحریک زوروں پر تھی اور پریم چند کے ذہن پر گاندھی کے فلسفے کی

* شعبہ اردو، اسلام آباد ماڈل کالج برائے خواتین (پوسٹ گریجوایٹ)، ایف ۷/۲، اسلام آباد

یلغار تھی۔ اس فلسفے کے زیرِ اثر پریم چند کے موضوعات اور اندازِ بیان میں نمایاں تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان کے معاشی اور سیاسی حالات کو ناولوں کا موضوع بنایا۔ اس دور کے نمایاں ناولوں میں، گوشۂ عافیت، نرملا، چوگانِ ہستی، پردۂ مجاز، غبن اور میدانِ عمل شامل ہیں۔ پریم چند نے ان ناولوں میں اقتصادی مسائل، سماجی حالات، طبقاتی کشمکش، جاگیرداروں کی پرتعیش زندگی اور کسانوں پر ہونے والے، ان کے مظالم کی تصویر کشی کی ہے۔

''گوشۂ عافیت'' (۱۹۲۰ء) اس دور کی اشاعت ہے جب ہندوستان میں تحریکِ آزادی عروج پر تھی اور ۱۹۱۷ء کا انقلابِ روس ذہنوں کو مسخر کر رہا تھا۔ ہندوستان کے سادہ لوح دہقان میں اپنے حقوق کا شعور سر اٹھا رہا تھا۔ گاندھی جی کسانوں کو بڑے زمینداروں اور ساہوکاروں کے پنجے سے نجات دلانے کے لیے کئی تحریکیں شروع کر چکے تھے۔ ان تحریکوں سے پریم چند نے گہرا اثر قبول کیا۔ چنانچہ ہندوستان کے سماجی حالات اور انقلابِ روس اور گاندھی کی تحریکوں نے ''گوشۂ عافیت'' کی تحریک دی۔ ''گوشۂ عافیت'' میں پہلی بار دہقانی زندگی، اس کی مشکلات اور سماجی ناانصافی کو پیش کیا گیا۔ بقول علی سردار جعفری:

> ''اُردو ہی نہیں پورے ہندوستانی ادب میں یہ پہلا ناول ہے جس میں دیہاتی زندگی کے بنیادی مسائل پیش کیے گئے اور جاگیرداری نظام کی سچی اور کئی پہلوؤں سے مکمل طور پر تصویر کشی کی گئی ہے۔''(۲)

جاگیرداری نظام کی ناانصافی سے ایک مدت تک کسان بے خبر رہے۔ وہ زمیندار کو اپنا مائی باپ، اپنی جان و مال کا مالک متصور کرتے تھے۔ لگان اور مختلف نوع کے ٹیکس اور ہرجانے بے چوں چراں ادا کرتے اور جبر کی چکی میں پستے رہتے تھے مگر زبان سے حرفِ شکایت ادا نہ کرتے تھے۔ زمیندار کسانوں سے وصولیوں کے لیے کارندے اور ہرکارے رکھتے تھے۔ لہٰذا کسانوں کا زمینداروں سے براہ راست رابطہ بہت کم ہوتا تھا۔ وقت بے وقت زمیندار ان کسانوں سے بیگار بھی وصول کرتے۔ مثلاً اپنے زیرِ کاشت کھیتوں پر ان سے ہل چلواتے اور کوئی اجرت نہ دیتے کسان ان زمینداروں کے ساتھ ان کے کارندوں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتے اور ان کے لیے بھی بیگار کرتے۔ اس طرح کسان دوہرے استحصال کا شکار ہوتا۔ ان تمام تفصیلات کے ساتھ پریم چند نے کسان میں بیدار ہوتے ہوئے شعور کو بھی پیش کیا جیسے ایک کردار بلراج کہتا ہے۔

> ''کاسکار کوئی چیج ہی نہیں ہوتا۔ وہ حمیدار کی گلامی ہی کرنے کے لیے بنایا گیا ہے لیکن ٹھاکر چچا کے گھر جو اکبار (اخبار) آتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ روس دیس میں کاسکاروں ہی کا راج ہے۔ وہی جو چاہتے ہیں کرتے ہیں وہاں تھوڑے ہی دن ہوئے کاسکاروں نے راجہ کو گدی سے اتار دیا ہے اور اب کاسکاروں کی ایک پنچایت راج کر رہی ہے۔''(۳)

مندرجہ بالا اقتباس یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ کسان و مزدور نے جاگیرداری نظام کے خلاف سر اٹھانا

سیکھ لیا تھا۔ اب وہ اپنے حق کو جان چکے تھے نیز انھیں اپنی طاقت کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ اس لیے شورشیں شروع ہو گئیں تھیں اور زمیندار طبقہ کسی حد تک کسانوں سے خوفزدہ تھا۔ گائتری کا کردار تشویش محسوس کرتا ہے۔

''یہ زمینداری کیا ہے بلائے جان ہے۔ مہینے دو مہینے کے لیے کہیں بھی چلی جاؤں
تو ہائے وائے مچنے لگتی ہے۔ اسامیوں میں سرکشی کا زور ہے۔ پہلے یہ کیفیت نہ تھی۔
سرکار کو ان پر سخت نگاہ رکھنی چاہیے ذرا بھی شہ ملی اور یہ قابو سے باہر ہوئے۔''(۴)

پریم شنکر ناول کا مرکزی کردار ہونے کے ساتھ پریم چند کا آدرش کردار بھی ہے۔ زمیندار طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا ہے اور غریبوں (کسان ومزدور) کا حق پہچانتا ہے اور ان کی زندگیوں کو سدھارنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ہندوستانی زمیندارانہ طرزِ زندگی کو چھوڑ کر کسان کی سیدھی سادھی زندگی اختیار کرتا ہے۔ کسانوں کی تنظیم کرتا ہے اور انھیں کھیتی باڑی کے جدید طریقے سکھاتا ہے تاکہ ان کی پیداوار زیادہ ہو اور وہ بہتر طرزِ زندگی اختیار کر سکیں۔ اس کو دیکھ کر مایا شنکر (جو زمیندار گیان شنکر کا بیٹا ہے) بھی اثر قبول کرتا ہے اور کسانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے کام کرتا ہے۔ پریم شنکر اور مایا شنکر کی کوششوں سے کسانوں میں شعور پیدا ہو گیا ہے اور ساتھ ہی زمیندار اور کسان کے بیچ کشمکش بھی پیدا ہو رہی ہے۔

''جمینکو کھیرات جوتتے ہیں، ان کا لگان نہیں دیتے۔ یہاں کوئی دیبل نہیں ہیں۔ جب
کوڑی کوڑی لگان چکاتے ہیں تو دھونس کیوں سہیں۔''(۵)

''گوشہ عافیت'' پریم چند کے طبقاتی شعور کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ پریم چند جانتے ہیں کہ اعلیٰ طبقہ اور نچلا طبقہ دو الگ الگ خانوں میں تقسیم ہیں۔ ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ زمیندار جو استحصال کرتا ہے اور کسان جو محنت کرتا ہے اور استحصال سہتا ہے۔ پریم چند کی تمام ہمدردیاں اس نچلے طبقے سے ہیں۔ اور وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ استحصال اس وقت رکے گا جب نچلا طبقہ خود اپنے لیے اجتماعی جدوجہد کرے گا۔ اس عہد کے مسائل کی پیش کش پریم چند نے بخوبی انداز میں کی ہے اس طرح یہ ناول ان کا ایک کامیاب ناول کہا جا سکتا ہے جو اپنے عہد کا مکمل عکاس ہے۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

''گوشہ عافیت'' سے اُردو ناول کی تاریخ میں ایک نئے موڑ اور ایک نئے دور کا آغاز
ہوتا ہے۔ اس میں ہندوستانی معاشرہ کی بڑھتی ہوئی طبقاتی آویزش اور اس کے بنیادی
مسائل کا احساس وشعور ناول کے فن کو ایک نیا روپ دیتا ہے اور ناول کو انسانی زندگی کا
رزمیہ بنا دیتا ہے۔''(۶)

چوگانِ ہستی (۱۹۲۴ء) ایک ضخیم ناول ہے۔ اس کے کرداروں کا تعلق ہر طبقے اور ہر مسلک سے۔ مجموعی طور پر اس ناول میں جس زندگی کی عکاسی ہوتی ہے وہ عہد غلامی کا وہ دور ہے جب ہندوستان میں جاگیرداری نظام ختم ہو رہا تھا اور سرمایہ دارانہ نظام کا ظہور ہو رہا تھا۔ پریم چند ہندوستان کی اس بدلتی ہوئی صورتحال سے بخوبی واقف

تھے۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی عمیق نگاہ نے بدلتے ہوئے معاشرے کا گہرائی و گیرائی سے مشاہدہ کیا تھا اور ان دونوں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظاموں کے تضاد و تصادم کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

چوگانِ ہستی کی کہانی، ایک نابینا بھکاری سورداس کی کہانی ہے اور یہ گاؤں ''پانڈے پور'' کی بھی کہانی ہے۔ اس ناول میں سورداس کی کہانی کے ساتھ ونے سنگھ اور صوفیہ کی داستان بھی متوازن چلتی ہے۔ جو قصے کی رنگ آمیزی کا کام کرتی ہے۔ سورداس کو زمین کا ایک ٹکڑا اپنے اجداد سے ورثے میں ملتا ہے۔ جو ایک چراگاہ کے طور پر کام آتا ہے۔ شہر کا ایک عیسائی رئیس جان سیوک، سورداس کی زمین پر سگریٹ کا کارخانہ لگانا چاہتا ہے اور اس زمین کو ہتھیانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ سورداس اپنی زمین نہیں دینا چاہتا مگر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ناکام ہوجاتا ہے اور جان سیوک زمین پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ دوسری طرف وہ لوگوں کو اس بات کا یقین دلانے میں بھی کامیاب ہوجاتا ہے کہ کارخانے میں انھیں مزدوری ملے گی جس کا انہی کو فائدہ ہوگا۔ وہ ہر انسان کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فن جانتا ہے۔ جبکہ سورداس کو اس بات کا یقین ہے کہ کارخانہ لوگوں کے لیے تباہی لائے گا۔ مگر اس کی ساری کوششیں، جان سیوک جیسے برسرِ اقتدار اور سرمایہ دار طبقہ سے تعلق رکھنے والے شخص کے سامنے اکارت جاتی ہیں۔ کارخانے کے قیام کے دوران اردگرد کے لوگوں کو اپنے گھر خالی کرنے پڑتے ہیں۔ ان میں سورداس بھی شامل ہے۔ وہ ایک بار پھر بھرپور کوشش کرتا ہے۔ مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور اب اپنے گھر سے بھی محروم ہونا پڑتا ہے۔ اس سارے عمل میں سرمایہ دار طبقہ بطور استحصالی طبقہ کے اپنے کردار کی وضاحت کرتا ہے۔ نیز سرمایہ دار طبقہ اور محنت کش طبقے کے درمیان کشمکش کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ جو پریم چند کی کامیابی کی دلیل ہے۔

جان سیوک اس عہد کے ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے کا نمائندہ ہے اور اپنی بنیاد میں استحصالی جذبہ کا حامل ہے۔ اس طرح اس عہد کے سرمایہ دار طبقے اور مزدور طبقے کے درمیان کشمکش کی فضا کی عکاسی بھی کی گئی ہے نیز بورژوا سیاست کے کھوکھلے پن کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ ناول کا ایک کردار ڈاکٹر گنگولی کہتا ہے:

> ''آج ہمیں نظر آرہا ہے کہ صرف ہم کو پیل کر تیل نکالنے کے لیے، ہماری ہستی مٹانے کے لیے، ہماری تہذیب اور انسانیت کا خون کرنے کے لیے ہم پر حکومت کی جارہی ہے۔''(۷)

''چوگانِ ہستی'' سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ صنعتوں کا قیام لوگوں کے استحصال کے لیے ہوا۔ سرمایہ دار طبقے نے اپنی جیبیں بھرنے کے لیے صنعتیں قائم کیں۔ انھیں مزدوروں کی ضروریات اور خوشحالی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ نکتۂ نظر مارکسزم کا عکاس ہے۔

''پردۂ مجاز'' ۱۹۲۸ء میں چوگانِ ہستی کے چار سال بعد لکھا گیا جو اولاً ہندی میں ''کایا کلپ'' کے نام سے شائع ہوا۔ پردہ مجاز کی کہانی ''چکر دھر'' جو متوسط طبقہ سے تعلق رکھتا ہے کے گرد گھومتی ہے۔ چکر دھر اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کے بجائے خدمتِ خلق کرنا چاہتا ہے۔ مگر والدین سے مجبور ہوکر ٹھاکر ہری سیوک سنگھ کی بیٹی منورما کا مدرس مقرر ہوجاتا ہے۔ منورما چکر دھر کو پسند کرنے لگتی ہے مگر چکر دھر کی

شادی اہلیا، نامی لڑکی سے ہوجاتی ہے۔ منورما کی شادی جگدیش پور کے راجہ بشال سنگھ سے ہوجاتی ہے۔ منورما اس سے شادی اس لیے کرتی ہے کہ وہ راجہ بشال سنگھ کی دولت اور اقتدار کے ذریعہ چکردھر کے اصلاحی کاموں میں مدد کرنا چاہتی ہے۔ چکردھر کی بیوی اہلیا کے حوالے سے انکشاف ہوتا ہے کہ وہ بشال سنگھ کی گمشدہ بیٹی سکھدا ہے۔ چنانچہ چکر دھر کا لڑکا شنکر دھر ریاست کا وارث بنتا ہے۔

متوسط طبقہ سے اعلیٰ طبقہ میں یہ شمولیت رویوں اور کرداروں کی کایا کلپ کر دیتی ہے۔ اچانک دولت کی یہ فراوانی اہلیا کو راس نہیں آتی وہ متوسط طبقے سے اعلیٰ طبقے میں شامل ہوکر اپنا توازن کھو دیتی ہے۔ اب وہ سہل پرستی اختیار کر لیتی ہے اور قوم کی خدمت کا جذبہ معدوم ہوجاتا ہے۔ (کرداروں کی یہ کایا کلپ ہمیں آنے والے وقت میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں بڑے واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اچانک ملنے والی دولت اخلاقیات کے لیے مضر ثابت ہوتی ہے)۔ اہلیا کے ساتھ ساتھ چکردھر بھی حکومت اور دولت کے نشے میں قوم کی خدمت فراموش کر دیتا ہے۔ مگر جلد ہی پریم چند اسے اس کے آدرش کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ محلوں کی زندگی چھوڑ کر (یہاں پریم چند گوتم بدھ کی روایت اختیار کرتے ہیں) دوبارہ خدمتِ خلق کرنے لگتا ہے۔ یہ تمام تفصیلات پریم چند کے آدرش کو نمایاں کرتی ہیں۔ وہ ایک انسان کو جس طرح دیکھنا چاہتے ہیں وہ چکردھر کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔

''میدانِ عمل'' ۱۹۳۲ء میں (اُردو میں) شائع ہوا۔ یہ وہ دور ہے جب روس انقلاب (۳۰ اکتوبر ۱۹۱۷ء) سے ہمکنار ہونے کے بعد دنیا بھر میں اپنے اثرات مرتب کر رہا تھا۔ اس ناول میں وہ تمام حالات وواقعات پیش کیے گئے ہیں۔ جس سے ایک دنیا گزر رہی تھی۔ ہندوستان میں کسانوں کے استحصال کا سلسلہ شدید نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری اور اس کے ساتھ لوگوں میں اپنے حقوق کا شعور بھی پیدا ہو رہو رہا تھا۔ نیز طبقات میں تقسیم معاشرے میں بغاوت کے سائے پھیل رہے تھے۔ ان سب کا احاطہ پریم چند نے بڑی عمدگی کے ساتھ اس ناول میں کیا ہے۔

یہ ناول بھی بہت سے کرداروں کو سامنے لاتا ہے جو بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں اپنے کردار کو واضح کرتے ہیں۔ سمرکانت ایک مہاجن ہے مذہب کا پابند مگر انسانیت کو اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہے۔ امرکانت اس کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو تعلیم حاصل کرتا ہے اور اس تعلیم اور اس کے استاد شانتی کمار کا اس پر واضح اثر موجود ہے۔ امرکانت اپنے باپ سے قطعی مختلف ہے۔ باپ اور بیٹے کے درمیان اختلاف رہتا ہے۔ سمرکانت اس کی شادی سکھدا سے کر دیتا ہے۔ جو عادات واطوار اور خواہشات کے لحاظ سے امرکانت سے بہت مختلف ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ امرکانت اپنے باپ کے کاروبار میں شریک ہو اور دولت کمائے مگر امرکانت اس کے لیے تیار نہیں۔ وہ جانتا ہے مہاجنی عمل کس طرح لوگوں کا خون چوستا ہے۔ وہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور اپنے استاد شانتی کمار کے ساتھ قومی

کاموں میں شریک ہوجاتا ہے۔ میونسپلٹی کا ممبر منتخب ہوتا ہے۔ ایک بیوہ پٹھانی کی بیٹی سکینہ سے محبت کرتا ہے مگر حالات ساز گار نہیں رہتے۔ چنانچہ وہ ہری دوار چلا جاتا ہے۔ جہاں ہریجنوں کی بستی ہے۔ اس بستی میں گودڑ چودھری، سلونی اور مُنی کی محبت اور ہمدردی اس کو پھر سے زندگی میں استوار کر دیتی ہے۔ وہ گاؤں کی اصلاح کے لیے کام کرتا ہے۔ کسانوں مزدوروں میں ان کے حقوق کا شعور پیدا کرتا ہے اور انھیں حکومت اور زمیندار کے خلاف اپنے حق کے لیے لڑنا سکھاتا ہے۔

''ہمارے لیے یہ اندھیر ہی قیامت ہے۔ جب پیداوار لاگت سے بھی کم ہو تو لگان کی گنجائش کہاں۔ اس پر ہم آٹھ آنے پہ راضی تھے۔ مگر بارہ آنے تو خواب وخیال ہے آخر سرکار کفایت کیوں نہیں کرتی ؟ پولیس اور فوج اور انتظام پر کیوں بے دردی سے روپے اٹھائے جاتے ہیں۔ کسان گونگے، بے بس، کمزور ہیں۔ کیا اس لیے سارا نزلہ انہیں پر گرنا چاہیے۔''(۸)

امر کانت جب گھر (دہلی) سے چلا گیا تو سکھدا پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ اس نے اپنی تمام عادات بدل لیں اور مزدوروں کے لیے کام کرنے لگی۔ ان کی تحریک کو سکھدا نے طاقتور بنایا اور بہت جلد اپنی محنت اور قربانیوں کے ذریعے ان کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی۔ سکھدا اور پروفیسر شانتی کمار مزدوروں کے لیے گھر حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر ناکام رہتے ہیں۔ مزدوروں میں غم وغصہ کی لہر ہے۔ سکھدا مزدوروں سے کہتی ہے:

''جس زمین پر تمہارا دعویٰ تھا وہ لالہ دھنی رام کو دے دی گئی۔ وہاں ان کے بنگلے بنیں گے۔ بورڈ کو روپئے پیارے ہیں۔ تمہاری جان کی اس کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں ہے۔ ان خودغرضوں سے انصاف کی امید چھوڑ دو۔ تمہارے پاس کتنی طاقت ہے اس کا انھیں خیال نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں یہ ادنیٰ درجے کے لوگ ہیں۔ ہمارا کر ہی کیا سکتے ہیں۔ انھیں ابھی ہماری طاقت کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔''(۹)

امر کانت کسانوں کی تحریک کے سلسلے میں گرفتار ہوا تو سمر کانت کو ہوش آیا۔ چنانچہ وہ بھی میدان عمل میں کود پڑے مزدوروں کے حقوق کے لیے تقریریں کرتے ہیں۔

''جس زمین پر ہم کھڑے ہیں یہاں کم سے کم دو ہزار مکان بن سکتے ہیں جن میں دس ہزار آدمی رہ سکتے ہیں۔ مگر یہ ساری زمین چار، پانچ بنگلوں کے لیے دی جارہی ہے۔ میونسپلٹی کو دو لاکھ روپئے مل رہے ہیں۔ شہر کے دس ہزار مزدوروں کی جان کی قیمت دو لاکھ کے برابر نہیں ہے۔''(۱۰)

سمر کانت گرفتار کر لیے جاتے ہیں۔ کسانوں کی تحریک زوروں پر ہے۔ سرکار پریشان ہوکر بڑے پیمانے پر انھیں گرفتار کر لیتی ہے۔ مگر تحریک کا زور نہیں ٹوٹتا، بلکہ اور لوگ بھی اس میں شامل ہوجاتے ہیں۔ سلیم جو سرکاری

ملازم ہے، کسانوں اور مزدوروں کی صحیح حالت کا اندازہ کرتا ہے تو سرکاری ملازمت چھوڑ کر تحریک میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس طرح پریم چند نے اپنے عہد کے ہندوستان کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ انقلابِ روس کے اثرات مارکسزم اور اشتراکیت، جتنے بھی رجحانات اس وقت ہندوستان میں جنم لے چکے تھے سب کا عمدگی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ پریم چند کا نکتہ نظر خالصتاً مارکس کا نکتہ نظر تھا، جسے انھوں نے اپنے تخلیقی سرچشمے سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔ ہندوستان اب انقلاب سے ہمکنار ہوا چاہتا ہے۔ جس کی نشاندہی کمار کے الفاظ میں کی گئی ہے۔ ڈاکٹر شانتی کمار مزدوروں کے حق کے لیے تقریر کرتے ہوئے سرمایہ داروں اور میونسپل بورڈ کے اہلکاروں سے کہتے ہیں کہ

''جب عقل پر انصاف کی جگہ خود غرضی کا غلبہ ہو جاتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ سماج میں زبردست انقلاب آنے والا ہے۔''(۱۱)

اس طرح ''میدانِ عمل'' میں پریم چند کسانوں اور مزدوروں کے طبقات میں طبقاتی شعور پیدا کرتے ہوئے انھیں عصر حاضر کی حقیقتوں سے آشنا کرتے ہیں اور ان پر واضح کر دیتے ہیں کہ عمل ہی انہیں حقیقی خوشیوں سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

''گئودان'' (۱۹۳۶) تک آتے ہوئے پریم چند مثالیت اور گاندھی واد سے دور نکل آئے ہیں۔ یوں تو عصری آگہی پریم چند کے اندر رچی بسی تھی اور اب ان کے خیالات و مشاہدات، تجربے کی بھٹی میں پک کر مستقل نظریات کی شکل اختیار کر چکے تھے لیکن بدلاؤ کی امید انھوں نے نہ چھوڑی تھی۔

''گئودان'' دیہات کے پس منظر میں ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جو ایک مذہبی مزاج کا کسان ہے اور برہمن کو خوش رکھنا اس کا دھرم ہے۔ پریم چند کے زیادہ تر ناولوں میں محنت کش طبقے کے افراد اور ان کی زندگی کو ہی موضوع بنایا گیا ہے مگر گئودان میں اس طبقے کی زندگی کو زیادہ وسیع تناظر اور گہرائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ہوری (مرکزی کردار) شمالی ہندوستان کے گاؤں بیلاری سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے وہی مسائل ہیں جو ہندوستان کے ایک عام کسان کے تھے۔ لگان، ٹیکس، جرمانے کی چکی میں پستے ہوئے لوگ جنھیں کوئی خواہش رکھنے کا حق نہیں ہے۔ ہوری کی بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کے دروازے پر گائے بندھی دیکھے۔ ہندو سماج میں گائے سکون اور خوشحالی کی علامت ہے۔ چنانچہ اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہوری، بھولا اہیر کو دوسری شادی کرانے کا لالچ دے کر اس سے گائے حاصل کرتا ہے۔ جسے ہوری کا بھائی ہیرا، حسد کی نظر سے دیکھتا ہے اور اسے زہر دے کر مار دیتا ہے۔ پولیس اسے گرفتار کر لیتی ہے۔ اس کو بچانے کے لیے بھی ہوری کو رشوت دینے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ ہوری جھنگری سنگھ سے پچاس روپے ادھار لیتا ہے۔ جب دھنیا (ہوری کی بیوی) کو پتہ چلتا ہے تو وہ جھگڑا کرتی ہے۔

''لیڈروں نے روپے چن کے اٹھا لیے تھے اور داروغہ جی کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کر

رہے تھے کہ دھنیا نے ایک اور ٹھوکر جمائی۔ جس کے روپے ہوں، اسے لے جا کر دے دو۔ ہمیں کسی سے ادھار نہیں لینا ہے اور جو دینا ہے تو اسی سے لینا۔ میں دمڑی بھی نہ دوں گی، چاہے مجھے حاکم کی کچہری جانا پڑے۔ ہم باکی (باقی) چکانے کو پچیس روپے مانگتے تھے تو کسی نے نہ دیا۔ آج انجلی بھر روپے ٹھنا ٹھن نکال کر دے دیئے۔ میں سب جانتی ہوں۔ یہاں حصہ بانٹ ہونے والا تھا۔ ____ یہ ہتھیارے گاؤں کے مکھیا ہیں۔ گریبوں کا کھون (خون) پینے والے۔ سود، بیاج، ڈیڑھی سوائی، نجر (نذر)، بھینٹ، گھوس، رسوت، جیسے ہو، گریبوں کو لوٹو۔''(۱۲)

یہاں دھنیا کا کردار ایک باغی کردار کے طور پر ابھرتا ہے۔ وہ محنت کش طبقے سے تعلق رکھتی ہے، اسے محنت پر یقین ہے مگر وہ اپنے حق کو بھی پہچانتی ہے۔ پریم چند کا یہ کردار ان لوگوں کا نمائندہ ہے جو اپنے حقوق کا شعور حاصل کر چکا ہے۔ اسے اپنے طبقے کی حقیقت سے آگہی ہوگئی تھی۔ نیز مندرجہ بالا اقتباس سے برسرِ اقتدار، جاگیردار اور مذہبی ٹھیکیدار جو اعلیٰ طبقے سے ہیں، کا نچلے طبقے (محنت کش، کسان) سے استحصالی رویہ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ جو پریم چند کے گہرے طبقاتی شعور کی دلیل ہے۔ ویسے بھی ہندو سماج، ذات پات کے نظام میں مبتلا سماج تھا، جہاں پریم چند جیسے حساس انسان کا طبقات کی کشمکش کو سمجھنا زیادہ مشکل نہ تھا۔

دھنیا کے علاوہ گوبر (ہوری کا بیٹا) بھی مزاحمتی کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جب ہوری زمیندار رائے اگر پال سنگھ سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے تو وہ کہتا ہے:

''جسے دکھ ہوتا ہے وہ درجنوں موٹر نہیں رکھتا۔ محلوں میں نہیں رہتا حلوا پوری نہیں کھاتا اور نہ ناچ ورنگ میں ہی پھنسا رہتا ہے۔ آرام سے راج کا سکھ بھوگ رہے ہیں۔ اس پر دکھی بنتے ہیں۔''(۱۳)

اس ناول میں جہاں پریم چند نے کسانوں کے استحصال کی تفصیلات پیش کی ہیں، وہاں انھوں نے دھنیا اور گوبر کے کرداروں میں طبقاتی وانقلابی شعور کی بھی عکاسی کی ہے۔ ایک اور موقع پر ہولی کے تہوار میں گوبر سوانگ کے بہانے ان تمام لوگوں کا مضحکہ اڑاتا ہے جو کسانوں کے استحصال کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اس کام میں گاؤں کے دوسرے نوجوان بھی گوبر کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس طرح پریم چند نے نئی نسل میں اپنے حقوق سے آگہی اور استحصالی طبقے (اعلیٰ طبقہ) کے خلاف طبقاتی شعور کو بھی جگایا ہے اور ان کے مزاحمتی رویے کو بھی پیش کیا ہے۔ گوبر کہتا ہے:-

''یہی جی چاہتا ہے کہ لاٹھی اٹھاؤں پٹیشوری، داتا دین، جھنگری سب سالوں کو مار گرادوں اور ان کے پیٹ سے روپے نکال لوں۔''(۱۴)

جھنیا کے معاملے میں بھی ہوری اور دھنیا کو تاوان دینا پڑتا ہے۔ ان کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے۔

ہوری اور دھنیا کے ذریعے پریم چند نے دیہی زندگی کے استحصالی نظام کا مکمل نقشہ پیش کر دیا ہے۔ نیز گوبر کے ذریعے اپنے حقیقت پسندانہ نظریات کا بھی اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ گوبر ہوری سے کہتا ہے:

''نہ جانے یہ دھاندلی کب تک چلتی رہے گی۔ جسے پیٹ کی روٹی میسر نہیں اس کے لیے آبرو اور مرجاد سب ڈھونگ ہے۔ اوروں کی طرح تم نے بھی دوسروں کا گلہ دبایا ہوتا، ان کا روپیہ مارا ہوتا تو تم بھی بھلے مانس ہوتے۔ تم نے بھی دھرم کو نہیں چھوڑا، یہ اسی کا ڈنڈ ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو یا تو جیل میں ہوتا یا پھانسی پا گیا ہوتا۔ مجھ سے یہ کبھی سہا نہیں جاتا کہ میں کما کما کر سب کا گھر بھروں اور آپ اپنے بال بچوں کے ساتھ منہ میں جالی لگائے بیٹھا رہوں۔''(۱۵)

دیہی زندگی کے ساتھ ساتھ پریم چند نے شہری زندگی کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انھوں نے شہر کے سرمایہ داروں، مل مالکوں اور کارخانہ داروں کے استحصالی نظام پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ صنعتی نظام کی چکی میں مزدور گیہوں کی طرح پستے ہیں اور اپنے لیے ایک صاف اور صحت مند زندگی حاصل نہیں کر پاتے۔ اس زاویے سے تفصیلات پیش کرتے ہوئے پریم چند نے ان مزدوروں کی کشمکش اور ان کی ابھرتی ہوئی قوت کو بھی ظاہر کیا ہے۔ مزدور بھی کسانوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ کسان جب زمینداروں اور ساہوکاروں کے ظلم کا شکار ہوتے ہیں تو وہ شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ شہروں میں وہ ملوں اور کارخانوں میں مزدوری اختیار کرتے ہیں اور جبر کی ایک نئی چکی میں پستے ہیں۔ ''گوبر'' بھی زمینداروں کے استحصال کا شکار ہو کر شہر جاتا ہے۔ وہ اس نئی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ جو استحصالی طبقات کی عیاری سے واقف ہے۔ شہر آ کر وہ مسٹر کھنا کی شکر مل میں کام کرتا ہے اور جب مل میں ہڑتال ہوتی ہے وہ پرجوش انداز میں اس میں شامل ہوتا ہے۔ مسٹر کھنا سرمایہ دار طبقے کا نمائندہ کردار ہے۔ یہ مل بھی کسانوں کی لوٹی ہوئی دولت سے وجود میں آتی ہے۔ راجہ پرتاپ اور رائے اگر پال سنگھ جیسے لوگ کسانوں کا استحصال کر کے حاصل کی ہوئی دولت اسے (مسٹر کھنا) فراہم کرتے ہیں۔ بینک منیجر اور شکر مل کے مینجنگ ڈائریکٹر کے کردار بھی جاگیردار گماشتوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے ذریعے سرمایہ دار یا جاگیر دار، نچلے طبقے کو اپنے استحصالی نظام میں جکڑے رکھتے ہیں۔ زمینداروں اور ساہوکاروں کی طرح مسٹر کھنا بھی استحصالی نظام کا حصہ ہیں۔

پریم چند مزدوروں کی بدحالی کی وجہ ان کی قلیل آمدنی کو سمجھتے ہیں۔ انھیں مزدوروں سے ہمدردی ہے۔ جب حکومت کی طرف سے مل پر ٹیکس لگتا ہے تو مسٹر کھنا مزدوروں کی اجرت اور کم کر دیتے ہیں۔ مزدور ہڑتال پر چلے جاتے ہیں پریم چند ان کی ہڑتال کو جائز مانتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر مہتا، مسٹر کھنا سے کہتے ہیں:

''کیا یہ ضروری تھا کہ ٹیکس لگ جانے سے مزدوروں کی اجرت گھٹا دی جائے؟ آپ کو سرکار سے شکایت کرنی چاہیے تھی۔ اگر سرکار نے نہیں سنا تو اس کی سزا مزدوروں کو کیوں دی جائے؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ مزدوروں کو اتنی اجرت دی جاتی ہے کہ اس

میں ایک چوتھائی کی کمی سے انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ کے مزدور بلوں میں رہتے ہیں، گندے اور بدبو دار بلوں میں جہاں آپ ایک منٹ رہیں تو قے ہوجائے۔ جو کپڑے وہ پہنتے ہیں ان سے آپ اپنے جوتے بھی صاف نہ کریں گے جو کھانا وہ کھاتے ہیں، وہ آپ کا کتا بھی نہ کھائے گا ___ آپ ان کی روٹیاں چھین کر اپنے حصہ داروں کا پیٹ بھرنا چاہتے ہیں۔''(۱۶)

مندرجہ بالا اقتباس سے سرمایہ دار نظام کی تمام قلعی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ پریم چند نے گئودان کے ذریعے یہ مطالعہ پیش کیا ہے کہ نظام کوئی بھی ہو غریب کا ہمیشہ استحصال ہوتا ہے۔ کوئی بھی نظام نچلے طبقے کے حالات نہیں سدھارتا بلکہ اسے بد سے بدتر بنا دیتا ہے۔ زمیندار اور سرمایہ دار کے مفادات باہم مشترک ہیں اور کسان اور مزدور کے حالات ایک جیسے ناگفتہ بہ ہیں۔ لہٰذا انقلاب ضروری ہے۔ یہاں وہ مارکسی رویہ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، مارکسی نظریہ اور پریم چند کی عصری آگہی مل کر طبقاتی نظام کو اضح کر دیتے ہیں۔ جو پریم چند کے طبقاتی شعور کی دلیل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اے۔ بی۔ اشرف، ''اشتراکی انقلاب کا اثر پریم چند کے ناولوں پر''، ساقی (کراچی، ۱۹۶۹ء)، ۶۶۔
۲۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب (علی گڑھ: انجمن ترقیٔ اُردو، ۱۹۵۷ء)، ۱۳۲۔
۳۔ پریم چند، گوشۂ عافیت، کلیات پریم چند، مرتبہ، مدن گوپال (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو، ۲۰۰۰ء)، ۵۹۔
۴۔ چند، گوشۂ عافیت، ۹۰، ۹۱۔
۵۔ چند، گوشۂ عافیت، ۸۱۔
۶۔ قمر رئیس، تلاش و توازن (دہلی: جمال پریس، ۱۹۶۸ء)، ۳۳۔
۷۔ پریم چند، چوگانِ ہستی (جلد دوم)، (دہلی: ادبی مرکز، سن ن)، ۵۰۲۔
۸۔ پریم چند، میدانِ عمل، کلیاتِ پریم چند، ۲۹۴۔
۹۔ چند، میدانِ عمل، ۲۴۰۔
۱۰۔ چند، میدانِ عمل، ۳۴۸۔
۱۱۔ چند، میدانِ عمل، ۵۲۔
۱۲۔ پریم چند، گؤدان، (نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۹۸ء)، ۱۴۶۔
۱۳۔ چند، گؤدان، ۲۲۔
۱۴۔ چند، گؤدان، ۲۲۶۔
۱۵۔ چند، گؤدان، ۴۵۷۔
۱۶۔ چند، گؤدان، ۳۶۷۔